اردو کی عوامی نظم میں سماجی حقیقت نگاری

(جعفر زٹلی اور نظیر اکبر آبادی کی نظم کاری کے حوالے سے)

Social Realism in Urdu Poem

ڈاکٹر شبیر حسین
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
ڈاکٹر محمد کامران
ڈائریکٹر ادارہ زبان وادبیات اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور

Abstract:

This article, The study of social realism in the classic popular Urdu Nazm with the special reference of Jaffar Zatali and Nazeer Akbar Abadi, deals with question how the popular literature may have concern to pin the social evils up creating the creative Pen- picture. This piece of research further adds value to the work of these two giants of classic Urdu Nazm as they contributed to the Urdu Nazm for what it would turn out to be after a century. This article based on the socially concerned study of Urdu Nazm aims at discussing the Stylistic and medium role in the effectiveness of the Pen Picture of the issues in the colonial age as well. Thus, it becomes a post-colonial study too as well.This paper studies the influence of two great popular poets on the literary movements that claimed great changes in the gener of Urdu Nazm later in later centuries.

کلیدی الفاظ۔ جعفر زٹلی، نظیر اکبر آبادی، میر، مصحفی، شہر آشوب، دہلی، سلیم اختر

سماجی حقیقت نگاری کے ادب میں ان گنت روپ بہروپ ہے۔ ادب اپنے اصل میں حقیقت اور تخیل کا خوش آمیزہ ہے۔ سماج جیسا بھی ہو اپنی اقدار میں بدلاؤ لانے کے سلسلے میں جمود کے قریب سست واقع

ہوتا ہے۔ ایک زندہ و متحرک ادیب جمود شکنی کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ یوں تو ہر ادب اپنی اصل میں جدت پسند ہوتا، مگر کئی ادیب جدت ہی کی بنیاد پر اپنے ادب کا محل اسارتے ہیں۔ تحرک و جمود کے اصول پر ارتقا کا دارومدار ہے۔ جب کسی ادبی تحریک کا بھی بنیادی مقصد کسی طرح حاصل ہو جائے تو وہ اپنی وجود کا جواز کھو دیتی ہے۔ جمود سے کلیشے جنم لیتا ہے جو اظہار کے تمام راستوں کو بری طرح بند کر دیتا ہے۔ یوں ہر سماج اور ادبی تحریک کی معروف رسمیات کا سیٹ ایک خاص وقت کے بعد تشکیلِ نو کا پابند ہو جاتا ہے۔

سماج اور ادب ایک دوجے کا اٹوٹ انگ ہیں۔ سماج کی حقیقتوں کا واضح اظہار اگرچہ اردو نظم نگاری میں ترقی پسند ادب کے ساتھ معروف ہوتا ہے، مگر ہم ان کے معنی خیز مطالعہ کے لیے عوامی شاعری کا رخ کر سکتے ہیں۔ عوامی اور عامیانہ شاعری سے موسوم اردو نظم میں زبان کے سخت، کھردرے اور غیر سندی استعمال سے اس عہد کے سماج کے جو بے لاگ نقشے بنتے چلے جاتے ہیں ان سے اردو نظم میں سماجی حقیقت نگاری جلوہ گر ہوتی ہے۔ غیر عمومی دماغ اس تبدیلی کی ضرورت کو بہت جلد یا وقت سے پیشتر ہی محسوس کرتے اور جمود شکنی کے لیے تحرک کا انتظام کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اردو نظم نگاری کی روایت میں ایک مربوط ارتقا اور مضبوط سلسلہ دکھائی دیتا ہے کہ کون سی تحریک نے کس نظم کو جنم دیا اور کون سا نظم کار کا تحریک کی کھاد بنا مگر جیسے کہ سفید کوے اور نیلی چڑیا کی حکیمانہ کہانیاں موجود ہیں، اسی طرح اس جہان نظم میں جعفر زٹلی اور کسی حد تک نظیر آکبر آبادی وہ نظم کار ہیں جن کے تخلیقی وجود نے اردو نظم کو روایت کی نظم نے تمام مراحل سے گزرتے ہوئے جس نہج پر متمکن ہونے پر فخر کرنا تھا، یہ دونوں نابغہ روزگار پہلے سے ہی اس مقامِ فن پر فائز تھے۔

جعفر زٹلی کا وہ کلیات جو رشید حسن خان نے مرتب کیا ہے، اپنے اندر وہ تمام شواہد رکھتا ہے جو جعفر زٹلی کی شعری عظمت کو تسلیم کروانے کو کافی ہیں۔ انجمنِ پنجاب اور سرسید کی اصلاحی تحریک نے ادب کے سماجی پہلو کو جس زاویے سے دیکھا ہے۔ جعفر زٹلی کے لیے یہ ایک معمول کا تجربہ رہا ہے:

> ”کلامِ جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اس کی بنیاد پر اردو زبان اس پر فخر کر سکتی ہے کہ شروع ہی سے یعنی اس زمانے سے جسے شمالی ہند میں اردو کے فارغ کا پہلا دور کہنا چاہیے، شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے لاگ بیان موضوعِ سخن کے طور پر ملتا ہے۔“(۱)

تمام نظموں کے مطالعے کے بعد اس جہانِ رنگا رنگ پر حیرت ہوتی ہے۔ زبان کے کھردرے پن سے خالص جذبے اور عمیق مشاہدے کی بو محسوس ہوتی ہے۔ صاف گوئی اور بے باک سخن دانی کلامِ جعفرؔ کے حوالے ہیں۔ اسی لہجے نے جسے اس عہد میں خام، بازاری اور کھردرا کہا گیا شاعری کو احتجاج اور بغاوت کا متحمل بنایا۔ جعفر زٹلی نے زندگی پر جو نظر کی، اس سے ہمیں انجمن پنجاب کی تحریک کی مقصدیت یاد آتی ہے، مگر جعفر کے زٹل نامے میں موجود کھردرا مگر براہ راست اسلوب کا رنگ ترقی پسند فکر کا پہلا منشور محسوس ہوتا ہے۔ جعفر نے نظموں کو عنوان دیئے۔ ہجو کے ذریعے اپنا غم و غصہ نوٹ کروایا اور 'شہر آشوب' کے ذریعے بے لاگ مبصر کا کردار ادا کیا۔ اس کی ہجو نگاری پر رشید حسن خان یوں تبصرہ فرما ہوتے ہیں:

> ”دورِ اول کی اس روایت نے جس کا سب سے بڑا نمائندہ جعفرؔ ہے، ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ اس کے اثر سے لسانی سطح پر اس کھردرے پن نے فروغ پایا جس کے بغیر احتجاجی شاعری سرسبز نہیں

ہو پاتی۔ لہجے کے بھاری پن کو برقرار رکھا، پرشور لفظیات کا ذخیرہ فراہم کیا، بیان کو اس ریشمی پن سے محفوظ رکھا جو لہجے میں تلوار کی جھنکار نہیں پیدا ہونے دیتا اور اس آہنگ کی تشکیل کی جو رومانیت سے دور کا واسطہ رکھتا ہے... کئی صدیوں پر محیط احتجاجی شاعری کا آغاز وارتقا اچھی طرح سمجھنے کے لیے شمالی ہند میں شاعری کے دور اول کی اس روایت سے واقف ہوں جس کا سب سے بڑا نمائندہ اور بنیاد گزار جعفرؔ ہے۔"(۲)

جعفر زٹلی کی شعری سلطنت میں ولی کا بھی گزر نہیں کہ جب ولی غزل کو حرز جاں بنائے ہوئے تھے اور دلی میں ان کا دیوان پہنچا، تب جعفر زٹلی کی نظم گوئی سن بلوغت میں تھی۔ نظم گوئی کی وہ روایت جو جدید نظم پر انتہا کرے جعفر سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی نظمیں جیسے دربیان دلاوری، اور در تعریفِ اورنگ زیب، جعفر کے سینے میں موجود ملی جذبات پر دلالت کرتی ہیں۔ سماجی حقیقت نگاری کی تاریخ میں جعفر زٹلی سے قدیم نام ہمیں اردو شاعری کی تاریخ میں نہیں ملتا۔

جعفر زٹلی کا دوسرا اہم کارنامہ لسانی سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اردو زبان کی تشکیلی عمر میں جعفر زٹلی نے جو کمک فراہم کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ریختہ گوئی کی پختہ شکلیں ہمیں جعفر کی نظموں میں دکھائی دیتی ہیں:

"میر نے اپنے تذکرے نکات الشعراء کے آخر میں ریختہ کی جو شکلیں بنائی ہیں (ریختہ بر چندیں قسم است) ان میں سے پہلی دو قسموں کی نہایت عمدہ اور بہت سی مثالیں جعفر کے یہاں ملیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہنے کی ہے کہ میر نے ریختہ کی جن قسموں (یاشکلوں) کا ذکر نہیں کیا، جعفر کے کلام میں ان کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں بعض نظمیں یکسر اردو میں ہیں۔ ان کو پڑھ کر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ گوئی نے اپنے نکھرے ہوئے انداز کو کچھ نہ کچھ پالیا ہے اور یہ کہ لسانی تبدیلی کا عمل تیزی کے ساتھ بروئے کار آرہا ہے۔ اس تغیر کی تیز روی کا اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عہد محمد شاہ میں، یعنی جعفر کا زمانہ ہوتے ہوتے نظم کی زبان نکھرنے لگی ہے اس میں صفائی اور روانی کے اجزا گھلتے جارہے ہیں۔"(۳)

جعفر کو عوامی پزیرائی بھی اس درجہ حاصل نہیں تھی جیسی کہ نظیر کے حصے میں رہی تھی۔ اس کا ایک سبب تو سماجی دوہری اقدار تھیں، جعفر کے کلام کا بچ رہنا اس امر کا ضامن ہے کہ جعفر کو پڑھنے، سننے والے لوگ موجود تھے مگر پر تکلف محافل کے آداب میں جعفر کے اشعار کو غیر ادبی اور نیم وحشی شے سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کے بعد میں تاریخ ادب لکھنے والوں نے بھی زٹل کو وہ مقام نہیں دیا جو اس کا حق تھا۔ اس کے کلام کے جنسی رخ کو بہت اچھالا گیا کہ وہ اس عہد کے تہذیبی کوڈز اور کنونشنز سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کا نفسیاتی تجزیہ یوں کیا ہے:

جعفر زٹلی کی شاعری کا نفسی ماخذ اس کی کجرو شخصیت ہوگی جس کا اندازہ "کلیات" (مطبوعہ: مطبع محمدی دہلی ۱۲۸۹ھ) کے ان جنسی اشعار سے لگایا جاسکتا ہے جو کسی نامرد کی جنسی فینٹسی محسوس ہوتے ہیں... تاہم کوڑے کے ڈھیر میں کچھ کام کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں اور اس کا منفی

رویہ بعض اوقات مثبت بھی ثابت ہوتا ہے، اس لیے اس کے کلام سے صرفِ نظر درست نہیں۔(۴)

سماجی حقیقت نگاری اور اس نوع کے سماجی موضوعات پر جعفر کی نظموں کو سامنے رکھتے ہوئے رشید حسن خان نے اسے اردو کا پہلا 'شہر آشوب نگار' کہنے کا بھی کہا اور لکھا ہے۔

'شہر آشوب' کی نظمیہ صنف کسی شہر یا ملک کے ہنگامی حالات و واقعات، سیاسی و معاشی انتشار، اخلاقی گراوٹ الغرض تمام سماجی و فکری اداروں کے احوال کو بیان کرنے کی شناخت رکھتی ہے۔ ایک تہذیب کے زوال سے لے کر انسانی نسل کے بہ حیثیتِ نوع ناکام ہو جانے کی داستان بھی شہر آشوب کے موضوعات سے باہر نہیں۔ اس میں مجلسی زندگی کے کسی پہلو کا نقشہ مزاحیہ، ہجویہ یا طنزیہ انداز میں کھینچا جاتا ہے۔ تاہم شہر آشوب کے پیچھے اگر درد دل رکھنے والا انسان موجود نہیں ہو گا تو کامیاب 'شہر آشوب' تحریر نہیں کیا جا سکتا۔ اس صنف پر بھی کوئی ہیئتی پابندی نہیں ہے۔ حاتم اور سودا کے ساتھ ساتھ نظیر اکبر آبادی نے شہر آشوب میں خاص تعارف حاصل کیا۔

کسی سماج کا حقیقی نقشہ شہر آشوب کے علاوہ کیسے کھینچا جا سکتا ہے ہے اس لیے لئے اگر شہر آشوب نے میں بہت زیادہ شہرت پائی تو اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگوں میں اپنے سماج کے حقیقی پہلو کو جاننے کا اور ان کو بیان کرنے کا کا خاص ذوق پروان چڑھ چکا تھا اس ذوق کی کی ٹھیک معنوں میں میں پرورش اور اگرچہ نظیر کے ہاتھوں ہوتی ہے ہے مگر یہ کہنے میں میں کچھ بات نہیں نہیں کہ جعفر زٹلی آسٹریلین نے بہت بے باک ہو کر کر اپنے سماج کا کا وہ نقشہ پیش کیا یا جو جو ایک عام فرد کے کے غم و غصے کا اظہار تھا ایک عام فرد مرد اپنی نجی محفلوں میں میں طاقت سرمایہ اور بادشاہی ہیں کج رویوں کا گلہ شکوہ کس شدت سے کر سکتا ہے اس کا اندازہ ہمیں جعفر زٹلی کی نظموں کے مطالعے سے ہوتا ہے جعفر زٹلی علی ڈیلی ثانیہ عتبار سے جو کام کیا وہ شعوری کوشش دکھائی نہیں دیتی تی ضد سماج کا سخت اور کھر درا رویہ پیش نظر تھا اور اسی کے سبب اس کا لہجہ بھی درد ہوتا چلا گیا یو یہ کھر درا لہجہ جو ہمیں جعفر زٹلی کے ہاں نظر آتا ہے ہے وہ وہ ایک ایک سماجی حقیقت نگاری کا کا براہ راست خطاب کرنے کا انداز ہے یہ خطاب اس نے ایک غصے سے بھرے ہوئے اوئے مجبور نہ کور اور جمہور کا کا نمائندہ بن کر پیش کیا ہے جعفر زٹلی کا شہر آشوب ہو ہو یا ہجویہ قصیدہ صبح جو چیز سب سے زیادہ دہ قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے ہے وہ اس کا کا براہ راست بات کرنے کا سلیقہ ہے یو شہر آشوب اب نہ صرف کے کے سماج کا منظر نامہ پیش کرتا ہے اور مختلف سماجی اداروں کی کی گراوٹ کو کو بیان کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ لسانی طور پر بھی بھی ان تجربات میں داخل ہو جاتا ہے جو اردو زبان کی کی ابتدائی صورت میں تشکیلی حالت میں ضروری تھے۔

یوں دوسرا نام نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ نظیر ایسا شاعرِ بے نظیر ہے جو بلاشبہ خود میں ایک الگ دبستانِ نظم ہے۔ نظم کی صنف نے ابھی تک کا جو سفر کیا ہے وہ کہیں نہ کہیں نظیر کی نظم نگاری کے دائرے سے مکمل باہر ہو کر نہیں کیا ہے۔ نظیر کی نظم قدیم شعرائے دکن کی تمام نظم نگاری سے مکمل طور پر مختلف ہے اور الگ جہان کی حامل ہے:

"قدیم شعرائے دکن نے نظم کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس لیے دکنی ذخیرے میں اعلا درجے کی نظموں کی کمی نہیں۔ شمالی ہند کا اکیلا نظیر اکبر آبادی دسیوں نظم گو شاعروں پر بھاری ہے۔ اس نے بے شمار موضوعات پر نظمیں کہیں اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے ان گنت جیتے جاگتے مرقعے پیش کر دیئے۔"(۵)

نظیر کو ابتدا میں ایک غیر اہم اور گمنام شاعر ہی متصور کیا جاتا رہا، انہیں تذکرہ نگاروں نے اگر قابل اعتنا نہیں سمجھا تو اس کا سبب وہی تہذیبی چلن تھا جو جعفر کے ساتھ بھی روا رکھا گیا تھا۔ نظیرؔ، سوداؔ اور میرؔ کے زمانے میں جوان تھے اور جراتؔ، انشاءؔ اور مصحفیؔ کے زمانے میں بڑھاپے کی طرف قدم اٹھا چکے تھے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ان اساتذہ کے ساتھ تواریخ میں نظیر کا نام نہیں ملتا ہے۔ نظیرؔ کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے کہ جب کہ نظیر کے کلام میں ایسا بہت کچھ ہے جو عوام کے ساتھ ساتھ خواص کے لیے بھی خاص شے ہے۔ نظیرؔ کی نظم نگاری کا سفر، نظیرؔ کے موضوعات کی بنا پر تمام عہد میں کچھ نہ کچھ دان کرتا ہوا مابعد جدیدیت تک جا پہنچتا ہے۔ نظیر نے مقامیت کو اپنا اولین نصب العین بنایا اور مقامی تہواروں، رسوم و رواج اور میلوں ٹھیلوں کے اس کلچر کو تصویر کیا جو اس عہد کی شناخت کا نشان تھا۔ نظیر نے مقامیت کو یوں ناگزیر سمجھا جیسے مابعد جدیدیت والوں کے ہاں سمجھا جاتا ہے جس کا ذکر پیچھے مابعد جدیدیت کے نظریہ میں ہو چکا ہے۔ نظیر نے نظم کو جن موضوعات سے آشنا کیا وہ نئی نظم کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ یہ ہندوستانی کلچر جو نظیر کے ہاں نظر آتا ہے اس میں افرنگ کر رنگ ابھی ویسا چڑھا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ یہ کلچر ایک ایسا کلچر ہے جو حقیقی معنوں میں ہند اسلامی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ نظیر ایک وسیع المشرب شاعر ہے جو ہر مذہب و قوم کے لوگوں کو بلا تمیز و تفریق زندگی اور سماج کا اہم جزو سمجھتا ہے:

"انہوں نے جہاں ہندوئوں کے تہواروں، میلوں اور رسموں پر شعر کہے ہیں وہیں مسلمانوں کے عرسوں اور تہواروں کو بھی یاد رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو صرف اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کی خوشیوں اور ان کے دکھ درد سے متعلق ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ نظیر کل عالمِ انسانیت کے شاعر ہیں۔"(٦)

نظیر کے ہاں موضوعات کا تنوع اپنی جگہ ایک اہم دبستان رقم کرتا ہے، اور دوسری طرف نظم کی تقریباً تمام معروف و غیر معروف ہیئتوں اور اصناف میں طبع آزمائی کرنا نظیر کی عظمت پر دال ہو جاتی ہے:

"نظیر نے ہر صنفِ سخن کو اپنایا۔ ان کے کلیات میں غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مسدس، ترجیع بند، مستزاد سبھی کچھ ہے اور زندگی کا کوئی رنگ، کوئی روپ ایسا نہیں جو ان کی نظر سے چوک گیا ہو۔"(۷)

یہ امر واضح ہے کہ جب نظیر نے تمام سماجی زندگی کے عنوانات پر نظمیں رکھیں ہیں تو اس سے اس سماج کا پورا لسانی ڈھانچہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ زبان میں وسعت آتی ہے اور ذخیرہ الفاظ وسیع بھی ہوتا ہے اور محفوظ بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب نظیر مختلف فنون معاشرہ پر نظمیں لکھتا ہے جیسا کہ کبوتر بازی، تیراکی، کنکوے بازی وغیرہ تو اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مقامی اصطلاحیں بھی اپنی ایک ایسی ڈکشنری مرتب کرتی ہیں جو بہ صورت دیگر کبھی لغت کے قابل نہیں سمجھی جاتیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے جب یہ کہا کہ کوئی آگرہ کی وجہ شہرت پوچھے تو جواب تاج محل اور نظیر اکبر آبادی ہو گا تو اس کے پیش نظر، نظیر جیسے آزاد مرد کی غیرت و حمیت بھی تھی اور فن کی سربلندی بھی۔ نظیر کو یوں تو extrovert یعنی بیرون بیں کہا گیا مگر یہ بیرون بینی ایک حساس دروں کے بغیر کبھی ممکن نہیں ہو سکتا:

"نظیر کی افسردگی خارجی حالات کے برعکس ایسی نفسی کیفیت معلوم ہوتے ہے جسے کیمیو فلاج کرنے کے لیے اس نے گلی کوچوں کی دنیا اور میلوں ٹھیلوں کی بھیڑ میں خود کو گم کرنا چاہا مگر جو مسلسل تخلیقی محرک کے طور پر برقرار بھی رہی۔ جبھی تو اس کے اشعار کی ندی "آہ" اور 'واہ' کے کناروں کے درمیان رواں دواں نظر آتی ہے۔"(۸)

نظیر نے نظم نگاری میں جتنی وسعت پیدا کی ہے وہ ایک پورے متحرک و فعال عہد کی کُلی حصہ داری کے برابر ہے۔ نظیر کو ایک پہلا 'ہندوستانی نظم نگار' کہا جائے تو اس پر صادق آتا ہے۔ تمام علوم نظیر نے پڑھ رکھے تھے، زبانیں جانتا تھا مگر مقامی زبان و لہجے کو فوق سمجھتا تھا۔

"شاعری کے اعتبار سے نظیر خالصتاً ہندوستانی شاعر ہے، اس کے ہاں مقامی رنگ نظموں میں ہی نہیں بلکہ غزلوں میں بھی ہے۔ اس پر مستزاد الفاظ کا وافر ذخیرہ بلکہ نیاز فتح پوری کے بقول تو الفاظ کے ذخیرہ کے سلسلہ میں اردو کا کوئی شاعر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نظیر نے "سوقین" کے الفاظ استعمال کیے تو اس کی وجہ عوام کی سطح پر آ کر بات کرنے کی خواہش تھی، ورنہ ان کے علم و فضل میں کسی طرح کا بھی شبہ نہیں۔ کئی زبانیں جانتے تھے اور اردو کے علاوہ فارسی دیوان اور فارسی نثر میں تو کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اس امر کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ وہ بے علم نہ تھے۔"(۹)

نظم اپنی پابند ہیتوں اور ان اشکال میں جو ہندوستانی نہیں بلکہ فارسی و عربی الاصل تھیں بڑے پیٹرن کے ساتھ رواں دواں تھی مگر اس پیٹرن کو روک کر نظیر جیسے دھاکے کو قبول کرنا اور اس جناتی نظم نگار کو اس صف میں جگہ دینا ممکن نہیں تھا کہ پھر توروایتی جھنڈا برداروں کے لیے کوئی جگہ موجود نہ رہ جاتی۔ نظیر کو مقامیت کا دیوانہ کہنا کی بجائے اور مقامیت کی عقل و ذہانت کو تسلیم کرنے کی بجائے عرب و فارس کے کلچر سے متاثرہ اذہان نے اس کو سوقیانہ پن قرار دیا، کسی نے محض بوہمین سمجھا تو کسی نے فارغ جانا۔ ڈاکٹر انور سدید نے نظیر کی شہرت اور فن کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کو ایک الگ جزیرہ ہی قرار دیا:

"نظیر کی خامی یہ ہے کہ وہ زمین کے ساتھ چمٹ جاتے اور جملہ حواس خمسہ کو سیراب کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان کی عمودی پرواز مدھم پڑ جاتی ہے۔ نظیر کی بے تکلفی دل کو جھنجھناتی ہے مگر روح کو متحرک نہیں کرتی۔ وہ ہمیں لذیذ رکھتے ہیں لیکن اکثر اوقات ابتذال میں بھی بے محابا کود جاتے ہیں۔ نظیر ہماری تاریخی ادب کا وہ جزیرہ ہے جو براعظم سے کٹا ہوا ہے اور بہت سے جھاڑ جھنکار کے باوجود خوش منظر لگتا ہے۔ بعض نقادوں نے عوامی شاعر کا خطاب دے کر انہیں ترقی پسند شاعروں کی صف میں نمایاں جگہ دی۔ لیکن نظیر ایسا شاعر تھا جس کی آواز اندر سے اٹھتی تھی اور جرس غنچہ کی صدا پر لپکتا چلا جاتا ہے۔"(۱۰)

نظیر نے تو گویا اپنے مرغوب مضامین کو ہر صنف میں بیان کر کے ان اصناف میں ایسی گنجائش پیدا کر دی کہ وہ ہمیشہ ان مضامین کے قابل ہو گئی ہیں۔ نظیر کے ہاں زندگی کا تصور سماجی عوامل اور روزمرہ کی رواں زندگی سے زیادہ کچھ نہیں۔ نظیر کے مطابق لسانی نظریات کسی سطح پر انسانی خدمت نہیں کر سکتے اگر وہ بول چال کے نظریہ کے قریب نہیں۔ نظیر کے لیے تاریخ انسانی ہو یا تاریخ ادب اس کا ہیرو عام آدمی ہے: عام زبان، عام موضوع، عام اظہار۔ نظیر نے وسیع کینوس اپناتے ہوئے طنز و ظرافت، نشاطیہ عناصر، جزئیات و مرقع نگاری، اصلیت و واقعیت نگاری جیسی خوبیوں سے وسیع ذخیرہ الفاظ چھوڑا ہے، یوں کہیے کہ ایک عہد کی تاریخ رقم کی ہے۔ جہاں اظہار براہ راست ہو وہاں اکہرے پن کا احساس ہوتا ہے، علامت پسندی کی گنجائش کم ہوتی ہے مگر نظیر کے ہاں بعض جگہوں پر علامتی شاعری کا ہنر کدہ بھی کھلتا ہے۔ 'بنجارہ نامہ' سے ایک بند دیکھیے:

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گوں تیری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے، سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی، پوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

فطری، ملی، قومی اور حقیقی زندگی کی 'ترجمان صنف نظم' جس کا ڈھول آزادؔ اور حالیؔ نے پیٹا وہ نظیر کی دکان سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے:

"نظیر ہماری زبان کے نہایت بلند رتبہ اور عظیم نظم نگار ہیں۔ بقول رام بابو سکینہ زمانہ موجودہ کی فطری اور قومی شاعری جس کی ابتدا مولانا آزاد اور حالی سے کی جاتی ہے، اس کے پیش رو بلکہ موجد نظیر اکبر آبادی کہے جا سکتے ہیں۔" (۱۱)

نظیر کی نظموں سے ترقی پسند فکر کے عناصر بھی با آسانی مل جاتے ہیں۔ یوں نظیر کی نظموں کو اس نقطہ نظر سے بھی ترقی پسند تحریک کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

"نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں معاشی جبر کی شدتوں میں پستا ہوا انسان نظر آتا ہے جس کے ہاں اپنی مادی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار ملتا ہے جس کے چہرے سے حزن و ملال، شکستگی، بے یقینی، افلاس، ناکامی، نامرادی عیاں ہوتی ہے... نظیر کی شاعری انسانی ذہن کی نفسیات میں اقتصادی و معاشی بحران کی تمثال کاری کرتی چلی جاتی ہے۔" (۱۲)

جعفر زٹلی اور نظیر اکبر آبادی کا تذکرہ اس لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ جب نظم حالی اور آزاد کے ہاتھ لگتی ہے (مقدمہ شعر و شاعری میں حالی اس پر گرفت کرتے ہیں یا آزاد اپنا انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے خطاب تحریر کرتے ہیں) تو گویا ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ موضوعاتی نظمیں یا زندگی کی درست براہ راست ترجمانی کوئی مغربی ایجاد ہے جس سے استفادہ ہم ایسے تہی دامنوں کے لیے ضروری ہے۔ مگر جعفر کی نظمیں اور نظیر کے مرقعے ہمیں اس احساس سے باہر لے آتے ہیں کہ یہ سب کسی صورت یہاں پہلے سے موجود ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔

اگر یہ رواج عام ہو رہا یا انجمنِ پنجاب سے اس کو قبولیت حاصل ہوئی تو اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ یہ محض انجمن کی کامیابی ہی تھی، یہ ایک بدلے ہوئے معاشرے کا اندازِ پذیرائی تھا۔ اس عہد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد کے اثرات نمایاں تھے۔ آہستہ آہستہ اپنی عسکری برتری کے علاوہ علمی برتری کا جو احساس مغربی استعماریت نے ہندوستان کی مقامی ذہنیت پر ثبت کیا تھا وہ ہی اصل کامیابی تھی جو برطانوی حاکمیت سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ یہ ایک مناظرے کی حالت سے برآمد زمانہ تھا جہاں اجناس کی قدر بدلے ہوئے معاشرے میں اپنے قابلِ قبول کردار سے تھی۔

اسی طرح جدید نظم اور ترقی پسند نظم دونوں کے انتہائی کنسرن وہی تھے جن پر جعفر اور نظیر کی عوامی شاعری کی بنیاد تھی۔ نظیر جدید نظم کے قریب ہیں تو جعفر کی باغیانہ روش (زبان کے انتہائی سوقیانہ رنگ کو ایک طرف رکھا جائے تو) ترقی پسند نظم کی پیش روئی بھی کرتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

(۱) رشید حسن خان۔ مقدمہ مرتب: زٹل نامہ، از جعفر زٹلی، (کراچی: آج، اشاعت دوم، ۲۰۱۲ء)، ص۱۷

(۲) ایضاً، ص۱۸

(۳) ایضاً، ص۲۵

(۴) سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء،) ص۱۵۷

(۵) سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۳ء) ص۲۲۰

(۶) ایضا، ص۲۲۲

(۷) ایضاً، ص۲۲۴

(۸) سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء) ص۱۷۹

(۹) ایضاً، ص۱۸۰